خلافت، خلافتِ راشدہ

(طریقِ انتخاب، نظامِ حکومت اور اساسی اداروں کا قیام ایک جائزہ)

* ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

عہدِ نبوی ﷺ میں تمام امور کا مرجع ذات رسالت مآب تھی۔ وحی الٰہی اُمت مسلمہ کی راہنمائی کے لیے موجود تھی۔ آپ کا تیئس سالہ دورِ نبوت اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں جتنے بھی امور طے پاتے تھے وہ بلاواسطہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق طے پاتے تھے۔ آپ ﷺ نے نظامِ حکومت کا بنیادی نقشہ تو ریاست مدینہ کی صورت میں پیش کر دیا، امورِ مملکت کو نمٹانے کے بنیادی اصول بھی عطا کر دیئے۔ حاکم و محکوم کے تعلقات، رعایا کے حقوق مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کس حد تک تمیز روا رکھی جا سکتی ہے، نیز ریاست کے مالی امور اور ریاست کی خارجہ پالیسی کے خدوخال بھی متعین فرما دیئے۔ زیرِ نظر صفحات میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد، خلافت و امامت کا مسئلہ کس طرح طے کیا گیا؟ جغرافیائی توسیع کی صورت میں پیش آمدہ مسائل کو کس طرح حل کیا گیا؟ نظامِ حکومت کو نئے تقاضوں کے مطابق کس طرح استوار کیا گیا، عہدِ جاہلیہ کی جو سیاسی روایات چلی آ رہی تھیں، اُن سے تجاوز کیا گیا یا نہیں اور اگر کیا گیا تو کس حد تک؟

ان سطور میں خلفائے راشدین کے تقرر کے طریقہ کار کو پیش کیا جائے گا لیکن آغاز میں خلافت اور بیعت کے اداروں (Institutions) کو مختصراً پیش کیا جائے گا۔

خلافت

خلیفہ کا لفظ خلافت سے مشتق ہے، خلافت کے لغوی معنی نیابت جانشینی اور کسی کی قائم مقامی کے ہیں۔ خلیفہ کو خلیفہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کا قائم مقام نائب اور جانشین ہوتا ہے۔

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

نظامِ خلافت کا نقطۂ آغاز اور سنگ بنیاد عقیدہ توحید اور میلان عبدیت ہے، اجتماعی زندگی میں اس عقیدہ اور میلان کا عملی ظہور اسلام کے سیاسی نظام کی شکل میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت وفرمانبرداری اور اپنے ابنائے جنس پر انہیں نافذ کرنا نظریہ خلافت کی روح اور اس کی حقیقت ہے۔(۱)

ہر سیاسی نظام میں ''مقتدرِ اعلیٰ'' کا تصور بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کا سیاسی نظام دنیا کے ہر سیاسی نظام سے کلیۃً ممتاز ہے۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ اس اعلیٰ ہستی کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے جو حقیقی مالک کائنات ہے۔ اس کا بنیادی اصول ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ اور فرمانروائے حقیقی محض اللہ جل شانہ ہے، اس کے علاوہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾(۲)

''آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے''۔

نظامِ خلافت کے اجزائے ترکیبی میں اقتدارِ اعلیٰ کے مندرجہ بالا تصور کو جزو اعظم کی حیثیت حاصل ہے۔ شخصیت کا انفرادی ادارہ ہو یا جمہوریت کا اجتماعی ادارہ کسی کو بھی ''مقتدرِ اعلیٰ'' کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

خلافت الٰہیہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس نظام میں احکام الٰہیہ نافذ ہوتے ہیں اور اس کا سربراہ (خلیفہ) احکام شریعہ کی تنفیذ اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ تھیاکریسی کی طرح اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ خلیفہ کوئی مقدس ہستی اور اللہ تعالیٰ کا نائب ہے جس کا ہر فرمان صحیح اور واجب التعمیل ہے، خلافت کا یہ مفہوم سمجھنا بالکل غلط اور تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔ چنانچہ جمہور علماء نے سربراہِ مملکت کے لیے لفظ ''خلیفۃ اللہ'' استعمال کرنے کو ممنوع اور ناجائز کہا ہے۔ ابوحیان خلیفہ کی اصطلاحی تعریف میں کہتے ہیں:

> ''وہ ہستی جس کے ہاتھ میں روئے زمین کے باشندوں کی سیاسی تنظیم و تدبیر کا کام ہو، جو انسانوں کے مفادِ عامہ کا نگران ہو اور جو حکومت کا حق دوسری قوت کی طرف سے حاصل کرے، خلافت خلیفہ کے کاموں اور کارناموں کی صورت اور ان سے جو منصب حکومت پیدا ہوتا ہے اس کا نام ہے''۔(۳)

علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

''خلیفہ وہ ہستی ہے جو کسی دوسرے کی نمائندہ اور نائب ہو''۔(۴)

اگلے صفحات میں ہم اس خلافت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو آخری انقلاب کے داعی پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کی نیابت سے حاصل ہوتی ہے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر دمشقی اسی خلافت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے بعد ان کی امت کے ارکان کو روئے زمین کی خلافت وحکومت دی جائے گی جو دنیا میں صحیح تمدن کو پھیلائیں گے، بدامنی دُور ہو کر امن قائم ہوگا، بندگانِ خدا ان کی حکومت کی اطاعت کریں گے، یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے''۔(۵)

خلافتِ راشدہ

اب ہم براہِ راست اس اصطلاح پر غور کریں گے جو اسلامی نظامِ سیاست کا اہم جزو ہے، یعنی ''خلافت راشدہ''۔ بہتر سے بہتر طرزِ حکومت جس میں ہر اچھے طرزِ حکومت کی جملہ خوبیاں، اخلاقی ہوں یا عمرانی، سیاسی ہوں یا تمدنی، قانونی ہوں یا اقتصادی پائی جائیں اور حکومتوں کے قلب وقالب میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں سب اس کے دائرہ عمل سے خارج ہوں، ایسے طرزِ حکومت کا نام ''خلافتِ راشدہ'' ہے۔ اس تناظر میں علماء کے نزدیک حضرت صدیق اکبرؓ سے لے کر جناب علی المرتضیٰؓ کا دورِ حکومت ''خلافتِ راشدہ'' کہلایا۔ چوتھی صدی ہجری کے بلند پایہ عالم اور حنفی فقہ کے ماہر ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

''خدا سے براہِ راست الہام کی قوت سے فیض یاب ہونے والے نمائندوں کے بعد خلفائے راشدین امامت وحکومت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں''۔(۶)

منصب خلافت اور فرائض

چونکہ خلیفہ رسول ﷺ کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے، اس بناء پر پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ آپ کا منصب کیا تھا، اور آپ کے فرائض وواجبات کیا تھے؟ آنحضرت ﷺ کے جو فرائض تھے، اصولی طور پر دو قسم کے تھے:

① اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے احکام و ہدایات لینا اور اُن کو اُمت تک پہنچانا۔

② اُمت کے لیے ایک ایسا مرکز اطاعت و فرماں برداری بننا کہ خواہ کسی قسم کا کوئی معاملہ ہو جو معاد سے متعلق ہو یا معاش سے، مادی زندگی سے اس کا تعلق ہو یا روحانی زندگی سے، کوئی سیاسی مسئلہ ہو یا سماجی، کوئی اخلاقی مسئلہ ہو یا اقتصادی ہر ایک میں آپ کا قول ایک آخری اور قطعی حکم کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جس سے انحراف و سرتابی جائز نہیں۔ قرآن مجید کا اعلان ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾(۷)

ظاہر ہے کہ پہلا فرض صرف آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص تھا۔ آپ خاتم النبیین تھے، جب آپ کی وفات ہوئی تو وحی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور اب کسی شخص کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ دوسرا فرض برابر قائم ہے اور قائم رہے گا۔ آنحضرت ﷺ کی جب وفات ہوئی تو "الیوم اکملت لکم دینکم" کے ارشاد کے مطابق شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ احکام و مسائل کی قانونی تنقیحات متعین ہو چکی تھیں اور اب آپ کے بعد آنے والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قانون کی روشنی میں اُمت کی راہنمائی کریں۔ پھر اس دوسرے فرض کے دو پہلو ہیں، ایک احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت اور دوسرے ان احکام کا اجراء اور ان کی تنفیذ، تبلیغ و اشاعت ہر صحابی کا فرض تھا لیکن احکام کی تنفیذ اور ان کا اجراء بغیر سیاسی طاقت و اقتدار کے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس سیاست شرعیہ کا جو مرکز ہوگا وہی خلیفہ یا امام کہلائے گا۔ خلیفہ اپنے عہد میں پوری اُمت کا مرکز اطاعت ہوتا ہے، اور اس کو مسلمانوں پر روحانی اور جسمانی، سیاسی اور اخلاقی ہر قسم کا اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ہر قول معروف قول فیصل اور ہر حکم واجب الاتباع ہوتا ہے۔ اس سے بغاوت کرنا یا اس کی نافرمانی ایسا ہی گناہ ہے جیسا خود آنحضرت ﷺ کی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ جن "اولوالامر" کی اطاعت کا حکم ہے ان سے مراد وہی لوگ ہیں جو منصب خلافت پر سرفراز ہوں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ و من عصانی فقد عصی اللّٰہ ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعصی الامیر فقد عصانی)) (۸)

ابن خلدون کے نزدیک اس مرتبہ جلیلہ کے لیے چار شرائط ہیں:

① علم: جب تک خلیفہ کو احکام و مسائل شریعت اور ان کے منابع و ماخذ کا علم نہ ہوگا وہ احکام خداوندی کا اجراء کیسے کر سکتا ہے۔ اس کو صاحب اجتہاد بھی ہونا چاہیے، کیونکہ تقلید محض نقص ہے اور امامت چاہتی ہے کہ اوصاف و احوال میں کمال ہو۔

② عدالت: چونکہ خلافت ایک منصب دینی ہے۔ اس بناء پر خلیفہ میں عدالت یعنی راست بازی و نیکوکاری کا ہونا ضروری ہے۔ اگر خلیفہ ممنوعات و محرمات شرعیہ کا ارتکاب کرتا ہے تو عدالت بالاتفاق ختم ہو جائے گی۔ البتہ اعتقادی بدعتوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں اختلاف ہے۔

③ کفایت: اس سے یہ مراد ہے کہ خلیفہ میں شرعی حدود کو قائم کرنے، مملکت اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے جس سمجھ بوجھ، حسن تدبیر، عزم و ہمت اور استقلال و جفاکشی کی ضرورت ہے، یہ سب اس میں پائے جائیں۔

④ سلامت حواس و اعضاء: جس کی وجہ سے اس کی کسی رائے اور عمل پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ یعنی خلیفہ کو آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں غرض ہر جسمانی عضو و جارح کے اعتبار سے تندرست و توانا اور صحیح و سلامت ہونا چاہیے۔ اس طرح باطنی قوتوں یعنی ذہانت، حسن تدبیر اور اعتدال مزاج وطبیعت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہیے۔(۹)

الماوردی نے انہی شرائط کو پھیلا کر چھ کر دیا ہے۔(۱۰)

مذکورہ بالا شروط پر تو سب کا اتفاق ہے لیکن ایک اور شرط بھی بیان کی گئی جو متنازعہ فیہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ خلیفہ کے لیے نسب بھی شرط ہے؟ اور اگر ہے تو کیا اس کا خاندان نبوت میں سے ہونا چاہیے یا صرف قریشی ہونے کی شرط ہے۔

ماوردی نے خلافت کے لیے جو شروط معتبرہ تحریر کی ہیں۔ ان میں ساتویں شرط قریشیت بیان کی ہے اور اس کو متفق علیہ کہا ہے۔(۱۱) علامہ ابن خلدون بھی اس شرط کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کو مختلف فیہ کہتے ہیں:

((و اختلف فی شرط خامس وھو النسب القرشی))(۱۲)

اور پانچویں شرط یعنی قریشی النسل ہونا اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری نہیں ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں:

((انها لیست بشرط عند امامنا))

''قریشیت ہمارے امام صاحب کے نزدیک امامت کے لیے شرط نہیں ہے''۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امام یوسف کی بھی یہی رائے ہے۔(۱۳)

نسب کے شرط ہونے پر علماء نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ان بحثوں کی روشنی میں اور اسلام کی روح اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے یہی رائے قوی معلوم ہوتی ہے کہ خلافت کے لیے نسب کی کوئی شرط نہیں۔ وہ دین اور پیغمبر اعظم جو مادی عصبیتوں کے بتوں کو خاک میں ملانے آیا تھا اور جس نے فی الواقع اپنے دعوے کو سچ کر دکھایا وہ خود ایک بت کو کیسے نصب کر دیتا۔لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق نے "الأئمة من قریش" سے جو استدلال کیا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر خاموش رہے تھے تو اس وقت اس سے ان کی مراد کیا تھی؟ بلاشبہ ان کا مطلب صرف اس قدر تھا کہ اس وقت کی سوسائٹی اور ان حالات میں قریش کو ہی یہ مرتبہ و مقام حاصل تھا کہ مسند امامت پر متمکن ہوں۔غیر قریشی کے امام بننے سے ملت اسلامی میں استحکام اور اجتماعیت کا قیام ممکن نہیں تھا۔چنانچہ اس موقعہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی تھی اس میں آپ نے فرمایا تھا:

((فاما العرب فلن تعرف هذا لامر الا لهذا لحی من قریش))(۱۴)

''اور عرب اس قبیلہ قریش کے سوا کسی اور ولایت و امارت سے آشنا ہی نہیں''۔

اس بحث سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قریش کو سیادت و امارت کا حقدار کہنے کا سبب یہ تھا کہ وہی قبیلہ اس وقت اکثریت میں اور طاقت میں اہم مقام رکھتا تھا،سو اس کو یہ امارت کی ذمہ داری سونپی جائے تا کہ امت خلفشار کا شکار نہ ہو۔اب قبائلی دور نہیں، دنیا کئی تجربات سے گزر چکی ہے،لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ گروہ یا جماعت (سیاسی) جسے قبولِ عام حاصل ہو جو عددی اعتبار سے بھی کثرت میں ہو اور قوت کے اعتبار سے بھی مضبوط ہو اسے امارت کا حق سونپا جانا چاہیے اور یہی اسلامی سیاست کی بنیادی روح ہے کہ لوگوں پر امیر اُن کی رضامندی سے مقرر کیے جائیں۔

بیعت

خلیفہ کا انتخاب کیسے ہو اس کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟ یہ بھی ایک بنیادی اور اہم سوال ہے۔اس لیے

کہ قرآن وسنت میں اس کے لیے کوئی صراحت موجود نہیں۔ حضرت عمرؓ تین چیزوں کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ اگر آنحضرت ﷺ ان کی حقیقت بتا جاتے تو مجھ کو دنیا ومافیہا سے زیادہ عزیز ہوتیں۔ ان میں سے ایک خلافت بھی ہے۔

آج یہ سوال ہر ذی شعور مسلمان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی سیاسی نظام جمہوریت سے قریب تر ہے یا ڈکٹیٹر شپ سے۔ خلیفۃ المسلمین کا انتخاب عام مسلمانوں کی رائے سے ہوگا یا ارباب حل وعقد کا فیصلہ معتبر ہوگا؟

آج کی دنیا میں انتخاب کے لیے بیلٹ پیپر یعنی ووٹ کی پرچی کے استعمال کا طریقہ رواج پذیر ہے۔ یہ طریقہ انتخاب کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔

اسلام میں اپنی رائے کے اظہار کے لیے ''بیعت'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ بیعت ایک آئینی عہد ہے۔(۱۵) جس کا تعلق عوام اور امام سے ہے۔ جس کے بغیر ریاست عامہ کے رئیس عام کا انتخاب قانونی تقرر کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ بیعت عملی سیاست کے دائرہ میں وہ قطعی سند ہے جس کی رو سے عوام امام کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور امام عوام کے سامنے اچھے طرز پر نظامِ حکومت چلانے کا عہد کرتا ہے۔

علماء نے بیعت کے دو آئینی درجے بیان کیے ہیں۔ پہلے درجے پر اسلامی ریاست کے قابل اعتماد اصحاب (اہل حل وعقد) بیعت کرتے ہیں۔ یہ محدود بیعت ہے مگر قانوناً بے حد مؤثر سمجھی جاتی ہے۔(۱۶) دوسرے درجے پر بیعت عامہ برسر عمل آتی ہے۔ اس صورت میں عوام عہد میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ آخر میں امام عوام کی موجودگی میں اس عہد کو مکمل کرتا ہے اور اس طرح یہ عہد ایک معاہدہ اجتماعی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔(۱۷) یہاں ضمناً اہل حل وعقد کے بارے میں مختصر گفتگو غیر موزوں نہ ہوگی۔ اس لیے کہ جب تک یہ واضح نہ ہوگا کہ اہل حل وعقد سے مراد کون سے لوگ ہیں اس وقت تک یہ بحث نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگی۔ کیونکہ اسلامی سیاسی نظام میں ''اہل حل وعقد'' جسے مختلف اوقات میں مختلف نام دیئے گئے، اولوالامر، اہل الشوریٰ، اہل الاجماع اور اہل الشوکہ وغیرہ۔ اہل حل وعقد کی اصطلاح ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے امام ابوالحسن علی اشعری نے استعمال کی، انہوں نے پہلی مرتبہ اسے اہل الشوری کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اشعری کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

((و ثبت امامة علی بعد عثمان بعقد من عقله من الصحابة من اهل الحل والعقد ولانه لم يدع احد من اهل الشوری غيره فی وقته)) (۱۸)

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت صحابہ میں سے اہل حل وعقد حضرات کی بیعت سے ثابت ہوتی ہے اور اس لیے بھی کہ اہل شوریٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلافت کے لیے دعوت نہیں دی''۔

اہل حل وعقد کا دائرہ ہر دور میں وسیع ہوتا رہا، لیکن ہم اپنی بحث کو صرف عہد خلافت راشدہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے دونوں خلفاء کا انتخاب اس سے الگ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا اور حضرت عمرؓ نامزد ہوئے۔ ان دونوں خلفاء کا انتخاب کرنے والے لوگ مدینہ کے ممتاز مہاجر اور انصار تھے، لیکن انتخاب کا باقاعدہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی تجویز کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب انتہائی نازک حالات میں ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس خلافت کی پیش کش لے کر آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان میں اصحاب شوریٰ شامل نہیں تھے۔ ابن قتیبہ اس واقعہ کو تفصیلاً بیان کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں:

لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر آئے اور کہا ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں، ہاتھ بڑھایئے، ایک نہ ایک امیر ہونا ضروری ہے اور آپ سب سے زیادہ اہل ہیں۔ آپؓ نے فرمایا یہ تمہارا کام نہیں، یہ کام اہل شوریٰ اور اہل بدر کا ہے، جس کی خلافت پر یہ لوگ رضامند ہو جائیں وہی خلیفہ ہوگا۔ (۱۹)

دوسرے مورخین نے بھی اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ طبری نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت کی تفصیل درج کی ہے۔ اُن کے نزدیک مہاجرین اور انصار اہل انتخاب تھے، جنہوں نے سب سے پہلے بیعت کی اور ان کے حلف کے بعد عام لوگ بیعت کے لیے آئے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((فلما دخل المهاجرون والانصار فبايعوه ثم يبايعه الناس))(۲۰)

''جب مہاجرین اور انصار بیعت میں داخل ہو چکے تب عام لوگوں نے بیعت کی''۔

اگر خلفائے راشدین کے عہد کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیا جائے تو اہل حل وعقد کے یہی معانی سمجھ میں آتے ہیں کہ وہ حضرات جنہیں عامۃ المسلمین قابل اعتماد واعتبار اور لائق عزت واحترام سمجھتے تھے انہیں اہل حل وعقد کا مقام ومرتبہ

حاصل تھا۔اس اسلامی روح کی روشنی میں آج اس بات پر غور کیا جا سکتا ہے کہ کون سے لوگ لائق اعتبار اور قابل عزت و احترام ہیں اور یہ جاننے کے لیے کون سے ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں مختلف تجربات ہوتے رہے ہیں اور ایک کے بعد دوسرے تجربہ سے گزرتے ہوئے دنیا آج کا جمہوری نظام وضع کر سکی ہے۔اس سے بہتر بھی کوئی طریقہ وضع کیا جا سکتا ہے مگر تجربہ اور کوشش شرط ہے۔

یہ تفصیلی گفتگو تو ایک ذیلی بحث تھی۔ ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بیعت سے کیا مراد تھی اور اس کا کیا طریقہ تھا۔ بیعت کیا تھی، اس پر تو گفتگو ہو چکی ہے، رہا اس کا طریقہ کار تو اس کی تفصیل یہ ہے۔

اسلامی معاشرے کے ارکان مل کر اپنے قائد و امام کے سامنے آتے ہیں اور حسب ذیل الفاظ میں احکام کی تعمیل اور اطاعت کا عہد کرتے ہیں:

① ہم بیعت کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ اسلام کے اساسی قانون کو قانون نبوت اور حکومت راشدہ کے قانون کو واجب التعمیل تصور کریں گے، اسلام کو زندگی کا نصب العین سمجھیں گے۔(۲۱)

② ہم اپنے قائد اور ریاست عامہ کے امام کی ہدایات کو توجہ سے سنیں گے اور ہر قسم کے حالات میں ان کی اطاعت کریں گے، خوش آئند زمانہ میں بھی اور سخت مشکلات کے دور میں بھی ہم کسی ہدایت کی تعمیل میں کسی قسم کا اختلاف اور بحث نہیں کریں گے۔ ہم جب زبان سے کوئی بات کہیں گے تو حق کہیں گے اور جب عمل کے میدان میں قدم باہر نکالیں گے تو حق کے لیے نکالیں گے، خواہ ہم کسی جگہ ہوں کسی حال میں ہوں، اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے شخص کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔

③ ہم اپنی قوت کی آخری حد تک اس عہد کی پابندی کریں گے، اور ہر مسلم کی بہتری اور خیر خواہی کو اپنا اصول سمجھیں گے۔(۲۲)

بیعت کرنے والوں کی طرف اس اظہار کے بعد امام منبر پر آتا ہے، اور واضح کرتا ہے:

اگر میں اچھے اصولوں پر قائم رہوں تو میری امداد پر کمر بستہ رہو اور اگر برا طرز اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔ جسے اپنی قوت کا گھمنڈ ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے اور جو کمزور ہے وہ میرے

نزدیک طاقت والا ہے۔ میں طاقتور سے کمزور کا حق لے کر ہی مطمئن ہوسکتا ہوں، جہاد و جنگ سے غفلت قومی ذلت کا سبب ہے اور بدکاریوں کے پیچھے جانا بربادی اور خدا کی مار کا موجب ہے۔ اگر میں اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کروں تو تم میری اطاعت کرو اور اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو تم میری ہدایات کی تعمیل سے انکار کر دو۔ ایسی حالت میں میرے حکم کی پابندی تم پر فرض نہیں ہے۔ صف بستہ نماز کی پیروی کرو، خدا کی رحمت تمہارے لیے ہے۔ (۲۳)

خلفائے اربعہ کا تقرر

ذیل میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے کہ خلفائے اربعہ (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ) کا تقرر کیونکر عمل میں آیا۔ آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو ابھی تجہیز و تکفین بھی نہ ہو پائی تھی کہ خلافت کے مشکل ترین فیصلے سے گزرنا پڑا۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو حاضرین ان کے وصال کے صدمہ سے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر موت کسی طرح وارد نہیں ہو سکتی۔ یہی وقت تھا جب انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے اور سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر امامت و سیادت کی بیعت کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، رسول اللہ ﷺ کے بعد امارت و سیادت ان کا حق ہے کیونکہ انہوں نے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کو اپنے ہاں جگہ دی اور ان کے ممد و معاون ہوئے تھے۔ (۲۴)

سقیفہ بنی ساعدہ کا یہ اجتماع تاریخ اسلام کا بڑا فیصلہ کن اجتماع تھا، شام کے وقت اس وقت مکمل ہوا جب ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور ابوعبیدہ بن الجراح کے ساتھ وہاں پہنچے۔ طبری کی روایت کے مطابق حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم اور ابوعبیدہ بن الجراح کے سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف لانے سے پہلے سعد بن عبادہ جو بیمار تھے اور کھڑے نہیں ہو سکتے تھے، اپنے بیٹے کے ذریعے انصار سے خطاب کر چکے تھے اور انہیں ان کی حیثیت اور مقام یاد دلانے کے بعد ان سے کہا تھا، امارت کا استحقاق ان کے سوا کسی اور کا نہیں۔ طبری نے جو خطبہ سعد سے منسوب کیا ہے، اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اے انصار کے گروہ تمہیں دین قبول کرنے میں جو سبقت اور اسلام لے آنے میں جو بزرگی حاصل ہوئی ہے اس میں کوئی عرب قبیلہ شریک نہیں ہے۔ محمد ﷺ کچھ اوپر دس سال نبوت پانے کے بعد مکہ میں تشریف فرما رہے اور اپنی قوم کو خدا کی عبادت اور خدا کے سوا دوسرے معبودوں سے اجتناب کی دعوت دیتے رہے۔ لیکن ان کی یہ دعوت ان کی قوم میں سے بہت کم لوگوں نے قبول کی۔ یہ تعداد اتنی تھوڑی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت و دفاع پر قادر نہ تھی اور نہ ہی ان کے دین کو بزرگی ہی دے سکتی تھی، وہ تو اپنی حفاظت و دفاع کی طاقت بھی نہ رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالی نے تمہیں یہ فضیلت دینا چاہی اور یہ عزت تمہارے لیے پسند فرما لی اور تمہیں اپنی نعمتوں کے لیے چن لیا، اس نے تمہیں اپنے نبی پر ایمان کی دولت بخشی، تمہیں یہ ہمت دی کہ تم نبی اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت کر سکو، تمہیں یہ اعزاز بخشا کہ تم اس دین اور اس کی ذات کی سربلندی کا ذریعہ بنو، تمہیں یہ توفیق عطا کی کہ تم اس کے دین اور اس کی ذات کے لیے اس کے دشمنوں سے جہاد کرو، تم اس کے دشمنوں پر بڑے بھاری ثابت ہوئے۔ حتیٰ کہ سارے عرب خوشی یا ناخوشی سے اللہ کے دین پر مجتمع ہو گئے اور نبیؐ کے دشمنوں کو سخت ذلت وخواری نصیب ہوئی، یہ صرف تم تھے اور تمہاری تلواریں تھیں جن کے سبب عرب کی زمین رسول اللہ ﷺ کے پاؤں میں بچھی اور عربوں کے سر ان کے حضور خم ہوئے۔ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو جس وقت وفات دی ہے، اس وقت وہ تم سے خوش تھے اور تم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ پہلے اس سے کہ اور لوگ ان کی نیابت کی طرف لپکیں، تم یہ بات اپنے لیے مخصوص کر لو کہ تم اور لوگوں کی نسبت اس کے زیادہ اہل ہو''۔ (۲۵)

رشید اختر ندوی حضرت سعد بن عبادہ کے اس خطاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سعد بن عبادہ کے اس خطاب میں کسی قدر مبالغہ تو ضرور تھا۔ انہوں نے اپنی خدمات کو گنوانے میں کسی قدر شاعری کی تھی، لیکن یہ حقیقت تھی کہ انصار کے سبب اسلام اور رسول اللہ ﷺ کو تقویت ملی تھی۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس بات کا اعتراف جنگ ہوازن کی غنیمتیں بانٹتے وقت

کیا تھا۔ مہاجرین کو بھی اس سے اختلاف نہیں تھا مگر سعد ایسا کہتے یہ بھول گئے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین ان میں آئے تھے ان کی حیثیت یہود ان مدینہ سے بہتر نہ تھی، وہ آپس میں لڑلڑ کر انتہائی پستی میں گر چکے تھے۔ خواہ وہ اوس تھے یا خزرج دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔(۲۶)

معروف مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں کہ سقیفہ کے اجتماع میں مہاجرین و انصار کے مابین خوب مباحثہ ہوا، لمبی لمبی تقریریں بھی ہوئیں اور اپنے حق کے لیے دلائل بھی دیئے گئے مگر بالآخر حضرت صدیق اکبر کی تقریر فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ نے محمد ﷺ کو اپنی مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا، انہیں امت پر شاہد بنایا، تاکہ اللہ کی مخلوق صرف ایک اللہ کی عبادت کرے۔ ان سے پہلے لوگ بہت سے معبودوں کو پوجتے تھے، اپنے ان معبودوں کے بارے میں ان کا گمان تھا، یہ ان کے شفیع بھی ہیں اور ان سے انہیں نفع بھی پہنچ سکتا ہے۔ حالانکہ ان معبودوں کی حالت یہ تھی کہ یہ یا تو پتھروں میں سے گھڑے گئے تھے، یا لکڑی میں سے بنے تھے۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَاللّٰهِ﴾.(۲۷)

''اللہ کے سوائے یہ لوگ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو انہیں نہ ضرر پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع بخش ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی بنیں گے اور ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اللہ سے قریب ہو جائیں''۔

یہ آیت مکمل کرنے کے بعد جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ عربوں پر یہ بات بہت گراں تھی کہ وہ اپنے آباء واجداد کے دین کو چھوڑ دیتے۔ اللہ نے یہ خلوص پہلے مہاجرین کو عطا کیا کہ وہ نبی کے قبیلہ میں سے ان کی پہلے تصدیق کریں اور ان کا ساتھ دینے والے بنیں، ان لوگوں پر جب ان کی قوم نے سختیاں کیں اور ان کو جھٹلایا اور سارے لوگ ان کے مخالف ہو گئے تو ان مہاجرین نے صبر سے کام لیا۔ اپنی تھوڑی تعداد کے باوجود دشمنوں سے نہیں ڈرے۔ حالانکہ ان کی ساری قوم اور سارے لوگ ان کے خلاف مجتمع ہو گئے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس زمین پر اللہ کی سب سے

پہلے عبادت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول پر سب سے پہلے ایمان لائے، وہی ان کے والی اور قبیلہ والے ہیں۔ انہیں ان کے بعد امر خلافت کا زیادہ حق پہنچتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی حق تلفی کا خیال یا ان سے جھگڑا صرف ظالم ہی کر سکتا ہے۔ یوں تمہاری سبقت فی الاسلام کے شرف سے بھی اے انصار کے گروہ انکار ممکن نہیں ہے۔ اللہ نے تمہیں اے انصار! اپنی مدد کے لیے چنا، تمہاری طرف رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی اور تم میں سے ہی ان کی اور ان کے صحابہ کی زیادہ تر بیویاں اور ساتھی ہیں۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ مہاجرین اولین کے بعد ہمارے نزدیک تم ہی منزلت وقدر والے ہو اس لحاظ سے ہم امراء ہوں گے اور تم وزراء ہو گے اور تمہارے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے اور نہ ہی تمہارے بغیر ہمارا کوئی فیصلہ ہوگا۔ (۲۸)

طبری نے بھی حدیث السقیفہ کے تحت جناب فاروق اعظم سے جو روایت درج کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

> اے معشر الانصار! تم اپنی جس بڑائی اور بزرگی کا ذکر کرو گے اس کے تم یقیناً اہل ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ عام عرب امور حکومت کے باب میں صرف قریش کے گروہ کو مستحق واہل جانتے ہیں، وہ کسی اور گروہ کی قیادت تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ وہ خاندان کے لحاظ سے بھی اوسط ہیں اور نسب کے اعتبار سے بھی، میں ان آدمیوں میں سے کسی کو امیر مان لینے پر آمادہ ہوں جس کی بیعت چاہو کر لو۔ (۲۹)

اس کے بعد حباب بن المنذر کی تقریر کا ذکر بھی آتا ہے، دو خلفاء کی تجویز، ایک مہاجرین میں سے اور ایک انصار میں سے بھی زیر غور آئی۔ بہر کیف تمام بحث وتمحیص کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کا یہ اجتماع جس سے شر کا اندیشہ تھا حضرت ابوبکر کی بیعت پر منتج ہوا اور اس اجتماع میں موجود کسی بھی شخص نے جناب ابوبکر کی بیعت سے روگردانی نہیں کی بجز جناب سعد بن عبادہ کے جو مسعودی کے مطابق تنہا اور اکیلے رہ جانے کے سبب شام بھاگ گئے۔ (۳۰)

سقیفہ بن ساعدہ کی یہ بیعت چونکہ اندرون خانہ تھی۔ اس لیے دوسرے دن بیعت عامہ مسجد نبوی میں منعقد ہوئی۔ ابن کثیر، الطبری اور ابن اثیر کی رو سے جناب عمر فاروق کے اصرار پر جناب صدیق اکبرؓ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور تمام مہاجرین وانصار نے ان کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی۔

خلیفہ دوم کا انتخاب

جناب صدیق اکبرؓ نے جب یہ محسوس کیا کہ اب زندگی کے تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں تو امر خلافت سے متعلق غور کیا اور اپنے قریبی ساتھیوں سے حضرت عمرؓ کے متعلق رائے دریافت فرمانے لگے، جناب عبدالرحمٰن بن عوف، جناب عثمان، جناب سعید بن زید اور اسید بن الحضیر سے باری باری ان کی رائے دریافت فرمائی۔ جناب طلحہ بن عبیداللہ سے ان کی رائے جاننا چاہی تو انہوں نے کہا:

آپ کے رب نے جب آپ سے پوچھا کہ آپ نے عمر کو اپنے بعد ہم پر حاکم کیوں منتخب کیا تو آپ کیا جواب دیں گے جب کہ آپ کو ان کی درشتی اور سخت گیری کا علم ہے۔ (۳۱)

طلحہ بن عبیداللہ کی یہ بات سن کر جناب صدیق اکبر نے اپنے تیمارداروں سے کہا کہ مجھے اوپر اٹھاؤ اور جب انہیں اوپر اٹھا دیا گیا تو انہوں نے طلحہ سے خطاب فرمایا:

کیا تم مجھے اللہ سے ڈراتے ہو۔ یاد رکھو جو تمہارے بارے میں زیادتی وظلم کا توشہ لے کر اللہ کے ہاں گیا وہ بڑے گھاٹے میں رہا۔ میں اللہ سے کہوں گا، اے اللہ میں نے ان پر اس آدمی کو اپنا جانشین بنایا جو تمہارے بندوں میں سب سے اچھا تھا۔

اس کے بعد آپ نے جناب عثمان کو طلب فرما کر حکم دیا، لکھو:

''یہ وہ تحریر ہے جو ابوبکر بن ابی قحافہ نے اس وقت لکھوائی جبکہ اس کا اس دنیا میں آخری وقت تھا، اور جب کہ وہ آخرت کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا اور اس وقت کافر بھی ایمان لے آتا ہے، فاجر کی بے یقینی بھی ختم ہو جاتی ہے اور جھوٹے کو بھی صداقت کی سوجھتی ہے۔ میں نے اپنے بعد تم میں عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین بنایا ہے۔ اس لیے اس کی بات سنو اور اس کی پیروی ضروری جانو اور میں نے خدا، اس کے رسول اس کے دین حتیٰ کہ اپنے آپ اور تمہارے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جو کچھ کیا ہے اچھا کیا ہے۔ عمر نے اگر میرا جانشین بن کر عدل وانصاف سے حکومت کی تو اس کے بارے میں میرا یہی گمان اور میرا یہی علم ہے اور اگر وہ بدل گیا تو پھر ہر شخص اپنے گناہ اور ثواب کا ذمہ دار ہے۔ میرا مقصود تو ہر حال میں بھلائی ہے۔ میں غیب کے بارے میں

کوئی علم نہیں رکھتا۔ وہ لوگ جو ظالم ہیں انہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ میں اللہ سے تم سب کے لیے سلامتی اور رحمت کا طلب گار ہوں''۔

ابن سعد ہی کا بیان ہے کہ یہ تحریر لکھوانے کے بعد جناب صدیق اکبر نے اس پر مہر ثبت فرمائی، پھر حضرت عثمان کو حکم دیا کہ باہر جاؤ اور میری یہ تحریر لوگوں کو پڑھ کر سنا دو۔ جناب عثمان مجمع عام میں پہنچے اور لوگوں سے پوچھا۔ اس صحیفہ میں جو کچھ لکھا ہے، کیا تمہیں اس کی تفصیل معلوم ہے۔ لوگوں نے کہا یقیناً اس پر لوگوں سے عثمان نے اس تحریر پر بیعت لی اور کسی نے بھی کسی قسم کے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ (۳۲)

خلیفہ سوم کا تقرر

ابن خلدون جناب فاروق اعظم کے مجروح ہونے کے بعد کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پھر انہوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا۔ ان سے کہا میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کو جانشین بنا دوں۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے اعتراض یا، کیا آپ نے مجھے اپنا جانشین بناتے وقت میری رائے بھی لی، جناب عمر نے اعتراف کیا ہم نے آپ سے مشورہ تو نہیں کیا۔ عبدالرحمان بولے تو پھر یہ ذمہ داری کبھی قبول نہیں کروں گا۔ اس پر جناب فاروق اعظم نے فرمایا۔ اچھی بات ہے، ہم سے وعدہ کرو کہ اس وقت تک خاموش رہو گے جب تک ہم یہ امر ان لوگوں کے سپرد نہ کر دیں جن سے رسول اللہ ﷺ وصال کے وقت خوش تھے۔ پھر انہوں نے جناب علی، جناب عثمان، جناب زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف کو اکٹھے طلب کیا اور ان پر یہ ذمہ داری ڈال دی اور انہیں اختیار دیا کہ اگر جناب طلحہ تین دن کے اندر اندر باہر سے مدینہ لوٹ آئیں تو انہیں بھی امیدواران خلافت اور اصحاب شوریٰ میں شامل کر لیں''۔ (۳۳)

یہاں ضمناً ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا کہ اس سے پہلے بھی اسلامی سیاسی نظام کی روح واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ جانشینی کے مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی تو ایک شخص نے جناب فاروق اعظم کو ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر کے انتخاب کی رائے بھی دی تھی۔ جناب فاروق نے اس شخص کو بڑے غصے کے ساتھ ڈانٹا اور فرمایا:

''اللہ تمہیں مار ڈالے بخدا اللہ کے نزدیک میری چاہت قطاً یہ نہیں ہے کہ میں ایسے شخص کو اپنا جانشین بنادوں جو اپنی بیوی کو اچھی طرح طلاق بھی نہیں دے سکتا''۔(۳۴)

یہ عبداللہ بن عمر کی اہانت نہیں تھی بلکہ اسلامی طرز حکومت کی روح کا اظہار تھا کہ کہیں اس میں رشتہ داریاں حائل نہ ہو جائیں۔

جیسے ہی جناب فاروق اعظم کی تجہیز و تکفین مکمل ہوئی، جناب مقداد بن الاسود نے جو مجلس مشاورت کے داعی مقرر کیے گئے تھے، انہوں نے مجلس مشاورت طلب کر لی۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب مجلس مشاورت نے طول پکڑ لیا اور اصحاب شوریٰ کی آوازیں خاصی بلند ہو گئیں تو جناب ابوطلحہ نے انہیں تنبیہ کی۔ یہ تنبیہ خاصی مؤثر ثابت ہوئی اور اصحاب شوریٰ میں سے تین بزرگوں جناب زبیر، جناب طلحہ اور جناب سعد بن ابی وقاص نے اپنے نام واپس لے لیے

جناب زبیر نے اپنی جگہ جناب علی المرتضیٰ کو جناب طلحہ نے جناب عثمان کو اور سعد نے اپنی جگہ عبدالرحمٰن بن عوف کو دے دی۔ یوں چھ کی مجلس شوریٰ نے اپنا کام تین بزرگوں کے سپرد کر دیا۔ پھر جناب عبدالرحمان بن عوف نے جناب علی اور جناب عثمان سے یہ تجویز پیش کی کہ ہم میں سے جو کوئی بیعت سے دست بردار ہو جائے ہم اسے حکم مان لیں گے اور اسے حق دیں گے کہ وہ باقی دو میں سے جسے چاہے خلیفہ منتخب کر لے، ابن کثیر لکھتے ہیں: ''دونوں بزرگ جناب علی اور جناب عثمان خاموش رہے اور اس پر جناب عبدالرحمٰن بن عوف نے سبقت لی اور فرمایا:

''میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں بخدا مجھ پر فرض ہوگا کہ میں تم دونوں میں سے جو زیادہ حقدار ہے اس کا تقرر کروں''۔(۳۵)

اس کے بعد مورخین کے مطابق جناب عبدالرحمٰن بن عوف نے لوگوں سے رائے لینا شروع کی، وہ خواص سے بھی ملے اور عام لوگوں سے بھی، ان کی رائے لی، یہاں تک کہ ان پردہ نشین خواتین سے بھی ان کی رائے لی۔ ابن کثیر کے مطابق انہوں نے بچوں سے بھی رجوع کیا۔ مختلف راستوں میں کھڑے ہو کر باہر سے آنے والے سواروں اور پیادوں سبھی سے ان کی رائے دریافت کی۔ اس کے بعد دونوں حضرات کو طلب کر کے ان سے سوال و جواب بھی کیے۔ (ہم اس ساری تفصیل کو یہاں بیان نہیں کرنا چاہتے کہ موضوع زیر بحث سے اس کا تعلق نہیں) بالآخر جناب عبدالرحمٰن بن عوف نے جناب عثمان کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور فرمایا:

''اے اللہ! سن لے اور گواہ بن جا، اے اللہ! سن لے اور گواہ بن جا، اے اللہ! سن لے اور گواہ بن جا کہ میں نے اپنی گردن کا بوجھ عثمان کی گردن پر رکھ دیا ہے''۔(۳۶)

عبدالرحمٰن بن عوف کے اس اعلان کے بعد تمام حاضرین نے جناب عثمان بن عفان کی بیعت کر لی۔

خلیفہ چہارم کا تقرر

جب باغیوں نے جناب عثمان بن عفان کو شہید کر دیا تو ایک انارکی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ باغی گروہ کے افراد جناب علی المرتضٰی، جناب طلحہ، جناب زبیر، جناب سعد بن ابی وقاص اور جناب عبداللہ بن عمر کے دروازوں پر مسلسل پانچ دن تک دستک دیتے رہے لیکن انہوں نے بیعت لینے سے انکار کر دیا۔ ابن کثیر کے مطابق پانچویں دن انہوں نے دھمکی دی اور مدینہ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر انہوں نے اپنے میں سے کسی کے ہاتھ پر آج کے دن بیعت نہ کر لی تو اگلے دن وہ جناب علی، جناب طلحہ، جناب زبیر اور دوسرے اکابر کو قتل کر دیں گے۔ ان کے الفاظ یہ نقل کیے گئے ہیں:

''خدا کی قسم اگر تم کسی ایک کی بیعت پر جمع نہ ہوئے تو ہم کل علی، طلحہ، زبیر اور بہت سے دیگر کو قتل کر دیں گے''۔(۳۷)

اس صورت حال میں جناب طلحہ اور زبیر سمیت مدینہ کے اکثر لوگ جناب علی المرتضٰی کی خدمت میں آئے اور ان سے درخواست کی کہ امارت قبول کر لیں۔ جناب علی المرتضٰی مسجد میں تشریف لائے اور بیعت عامہ ہوئی اور ابن اثیر کی اسی روایت میں درج ہے کہ سب سے پہلے بیعت کرنے کا اعزاز پانے کا شرف جن دو بزرگوں کو حاصل ہوا وہ جناب طلحہ اور جناب زبیر تھے۔

ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن میں حضرت طلحہ اور زبیر سے یہ منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم سے جبراً بیعت لی گئی ہے۔ ہم کو اس سے سروکار نہیں، ہمارا مدعا اس سے پورا ہو جاتا ہے کہ حضرت علی کی بیعت پر تمام لوگوں نے اتفاق کیا۔ صحابہ کرامؓ کی اکثریت بیعت کرنے والوں میں شامل تھی۔ چند نام ایسے مذکور ہیں جنہوں نے بیعت نہیں کی۔ جن میں حسان بن ثابت، کعب بن مالک، زید بن ثابت اور ابوسعید الخدری، رافع بن خدیج، نعمان بن بشیر شامل ہیں۔

گنتی کے افراد کے سوا مدینہ کے تمام لوگوں نے بیعت کر لی اور سب سے آخر میں بیعت کرنے والے جناب سعد بن ابی وقاص اور جناب عبداللہ بن عمر تھے۔ اس وقت اسلامی حکومت میں شامل ماسوا شام کے تمام صوبوں مدینہ، مصر، عراق، ایران، یمن، بحرین وعمان وغیرہ سب نے حضرت علیؓ کی امارت کو تسلیم کرلیا اور آپ کے لیے بیعت کر لی۔

نظامِ حکومت

سب سے پہلے اس امر پر مختصر بحث ضروری ہوگی کہ اسلام کا نظامِ حکومت شخصی تھا، جمہوری تھا یا تھیا کریسی کی بنیادوں پر استوار ہوا۔

ہر ملک کا نظامِ حکومت اس کے تمدنی ماحول سے مناسبت رکھتا ہے بلکہ بالعموم وہ اسی کی تخلیق ہوتا ہے۔ قدیم قبائلی تمدن میں معمولاتِ زندگی مختصر اور سادہ تھے۔ لہٰذا لوگوں کی ضروریات اور حکومت سے توقعات بھی محدود تھیں۔ معاشی نظام بھی سادگی سے عبارت تھا، امورِ مملکت میں بھی اسی سادگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ حکومتی نظام کے جدید ڈھانچہ اور اس سے منسلک اداروں کا ایک ایسے وقت کے حوالے سے تصور کرنا جب تمدنی زندگی بالکل سادہ تھی نامناسب بات ہوگی۔ درحقیقت ہر دور کے تمدنی ماحول اور اس کے تقاضوں کے مطابق حکومت کے ڈھانچے اور اس کے فرائض اور سرگرمیوں کا تصور کیا جاتا ہے۔ جوں جوں معاشی اور معاشرتی ترقیاں رونما ہوتی جاتی ہیں، حکومتی نظام بھی اس کے مطابق وسیع بنیادوں پر استوار ہوتا چلا جاتا ہے، الغرض کسی سیاسی نظام کی نوعیت کو پورے مروجہ نظام کے حوالے کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ نبی ﷺ کے دورِ مبارک میں عربوں کا قبائلی نظام ہی اس سیاسی نظام کی اساس تھا۔ اسلام نے اس کے بنیادی اصول، دائرہ کار، اور مقاصد کا بتدریج نئے سرے سے تعین کر دیا۔

نبی ﷺ کے دور میں مدینہ کی اسلامی ریاست کا نظامِ حکومت سادہ تھا اور نئے سیاسی نظام میں فکری مقاصد کے حصول پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں جوں جوں اسلامی ریاست کی حدود میں وسعت آتی چلی گئی اور اس کے دائرہ کار اور وسائل میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا تو حکومتی ڈھانچہ کی نشوونما بھی وسیع تر بنیادوں پر استوار ہونا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ ریاست کی قوت اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی انقلاب متعدد ممالک تک نفوذ کر گیا۔ اس نظامِ حکومت کا تجزیہ کیا جائے تو تین ستون نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں:

① عاملہ، ② مقنّنہ، ③ عدلیہ

یہ تینوں ادارے موجود تھے لیکن ان کی اپنی منفرد صورت تھی۔ چنانچہ عاملہ کی شکل خلافت کے ادارے کی صورت میں قائم تھی۔ گزشتہ صفحات میں اس خلافت کے ادارے کا ذکر تفصیلی طور پر ہو چکا ہے۔ جبکہ خلیفہ کی معاونت کے لیے مشاورت کا ادارہ موجود تھا، یہ ادارہ جدید کابینہ اور مجلس قانون ساز دونوں کا متبادل تھا۔ جبکہ اسی دور میں عدلیہ یعنی قضاء کا محکمہ بھی قائم کیا گیا تھا۔

رہی یہ بات کہ یہ دور جمہوری تھا یا شخصی؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے خلفاء کے انتخاب یا تقرر پر غور کرنا ہوگا اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ حکومت کا میلان ذاتی اختیارات پر تھا یا عام رائے پر۔ اس امر کو واضح کرنے کے لیے اس باب میں خلفائے اربعہ کے تقرر کی ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ خلیفہ اوّل کے انتخاب سے حضرت عمر کی نامزدگی، جناب عثمان کے انتخاب کے لیے مجلس مشاورت کے قیام اور پھر حضرت علی کے عمومی انتخاب تک نظر ڈال لیجئے، ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ رائے عامہ ان کے ہمنوا تھی۔ چاروں خلفاء کا چناؤ اس وقت کے سیاسی تمدن کے مسلمہ جمہوری اصولوں کے مطابق تھا، یعنی خلافت کے منصب کے لیے اپنے جانشین کا تقرر کرانے کے لیے خلفاء نے قرابت داری یا ذاتی پسند کو مدنظر رکھنے کی بجائے امت کے وسیع تر مفادات کو مدنظر رکھا۔ جس کی تائید و حمایت عامۃ الناس سے حاصل کی۔ یہ عمل ایک نوزائدہ فکری مملکت کے تقاضوں کے مطابق نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے ہمہ گیر طریق انتخاب سے اس دور کی تہذیب آشنا نہ تھی بلکہ بالغ رائے دہی کے اصولوں کی بناء پر قائم انتخابی نظام تو برطانیہ میں بھی گزشتہ صدی میں رائج ہوا۔ الغرض خلفائے راشدین کے تقرر میں اہلیت اور اس دور کے سیاسی رواجات یعنی قبائلی روایات کو پوری طرح مدنظر رکھا گیا۔ ابن خلدون نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انتخابی اصول کو ترجیح حاصل تھی۔ (۳۸) علاوہ ازیں تقرری کے بعد بیعت لی جاتی تھی جو دوطرفہ معاہدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

دوسری بات پر اس پہلو سے غور کیا جا سکتا ہے کہ جمہوری اور شخصی طریق حکومت میں جو چیز سب سے بڑھ کر مابہ الامتیاز ہے وہ عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے۔ یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا زیادہ حق ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ اس اعتبار سے خلفائے راشدین کے طرز عمل کو دیکھ لیجئے کہ عوام کس قدر بااختیار تھے، انہیں امورِ ملکی میں کس حد تک دخل اندازی کی اجازت تھی۔ واقعات سے کتب سیر بھری پڑی ہیں،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرمادیا تھا:

((لا خلافة الا عن مشورة)) (۳۹)

''مشورہ کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں''۔

ہمارے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ خلفائے راشدین کو یہ جمہوری طرزِ سیاست، عرب جاہلیہ سے ملا تھا، شبلی لکھتے ہیں:

''عرب میں مدت سے تین وسیع حکومتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی، لیکن یہ سب شخصی تھیں۔ قبائل کے سردار جمہوری اصول پر منتخب کیے جاتے تھے لیکن ان کو کسی قسم کی ملکی حکومت حاصل نہ تھی''۔ (۴۰)

خلفاء نے تہذیب وترمیم کر کے اس نظام کو اعلیٰ قدروں کا حامل بنادیا، لیکن یہ امر بھی واضح ہے کہ موجودہ دور میں مروجہ جمہوری نظام کو بالکلیہ اسلامی نظامِ حکومت قرار دینا بھی درست نہیں۔ مثلاً اسلامی سیاسی نظامِ حکومت کا مرکز ومحور قرآن وسنت ہیں، اگر ملک کا ہر فرد بھی قرآن وسنت کے فیصلے کے خلاف ووٹ دے پھر بھی خلیفہ، یا امیر المومنین ان کی رائے کا پابند نہیں، یہ وہ بنیادی فرق ہے جو مروجہ جمہوری سیاست اور اسلامی نظامِ سیاست میں مابہ الامتیاز ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ جمہوریت کی یہ بنیادی روح کہ حکمران کو عوامی تائید حاصل ہونا چاہیے، اسلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

جغرافیائی توسیع اور اس کے اثرات ونتائج

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسے حالات میں عنانِ حکومت سنبھالی کہ اسلامی حکومت ابھی مستقل بنیادوں پر استوار نہ ہو پائی تھی۔ وفات رسالت مآب ﷺ سے طرح طرح کی عصبیتیں اور فتنے سر اُٹھا رہے تھے، کہیں مدعیانِ نبوت کا فتنہ تھا تو کہیں مانعین زکوٰۃ کا۔ الغرض عہد صدیقی پر نظر ڈالیں تو یہ داخلی امن وامان کے قیام پر صرف ہوا۔ یہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کمال تھا کہ ان داخلی ریشہ دوانیوں سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی ریاست کی حدود کو بھی توسیع دی۔ چنانچہ ۱۳ھ میں اسلامی حکومت ایران وشام تک پہنچ گئی۔ عراق، حیرہ سے انبار تک اور شام اجنادین تک اسلامی مملکت کا جزو بن گیا۔ آپ کے انتقال کے بعد عہد فاروقی کا آغاز ہوتا ہے اور پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے تدبر، حکمت عملی اور جرات نے فتوحات اسلامی کے جھنڈے اس طرح لہرائے کہ آج بھی تاریخ کا

طالب علم جب ان پر نظر ڈالتا ہے تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقبوضہ ممالک کا کل رقبہ ۲۲۵۱۰۳۰ میل مربع یعنی مکہ معظمہ سے شمال کی جانب ۱۰۳۶، مشرق کی جانب ۱۰۸۷ اور جنوب کی جانب ۴۸۳ میل تھا۔ مغرب کی جانب چونکہ صرف جدہ تک حکومت تھی، اس لیے وہ قابل ذکر نہیں۔ اس میں شام، مصر، عراق، جزیرہ، خوزستان، عجم، آرمینیہ، آذربائیجان، فارس، کرمان خراسان اور مکران جس میں بلوچستان کا کچھ حصہ آتا ہے، شامل تھا۔ (۴۱)

عہد عثمانی میں ممالک محروسہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہوا، افریقہ میں طرابلس، برقہ اور مراکش (افریقہ) فتح ہوئے۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصلہ ملکوں میں افغانستان، خراسان اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگیں ہوا، دوسری سمت آرمینیہ اور آذربائیجان مفتوح ہو کر اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت عثمان نے ہی بحری بیڑہ تیار کر کے جزیرہ قبرص (سائپرس) پر اسلامی پھریرا بلند کیا۔

جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا پورا زمانہ خانہ جنگی اور شورش کی نذر ہوا۔ اور پانچ سالہ دورِ حکومت کا ایک لمحہ بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ اس لیے آپ کے زمانہ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا۔

عہد خلفائے راشدین میں جب اسلامی ریاست کو اس قدر وسعت حاصل ہوئی تو اس سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہوئے جن سے اسلامی حکومت کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ سب سے پہلی چیز تو یہ سامنے آئی کہ جوں جوں اسلامی ریاست میں توسیع ہوتی گئی، انتظامی معاملات بھی بڑھتے گئے، مثلاً پہلے جو کام ایک ہی شخص کرتا تھا، محکمہ قضاء بھی اس کے پاس تھا۔ پولیس کی کارروائی بھی خود ہی کرتا تھا، جب کبھی فوجی ذمہ داری نبھانا پڑتی اسے بھی سرانجام دیتا تھا۔ اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ عہد صدیقی سے ہی اس جانب توجہ شروع ہو گئی تھی اور دورِ فاروقی میں تو مستقل ادارے وجود میں آ گئے، پھر خلافت جناب عثمان میں ان اداروں کو مزید ترقی ملی۔ اس کے علاوہ جہاں فتوحات ہوئیں وہاں ذمیوں سے متعلق معاملات میں بھی اضافہ ہوا۔ زمین فتح ہوئی تو اس کی تقسیم کے مسائل پیش آئے۔ نئے معاشروں سے واسطہ پڑا تو ان کے رسم و رواج اور بود و باش کے طور طریقوں سے یگانگت کے مراحل سے بھی گزرنا پڑا، غلاموں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اس مسئلہ کو بھی اسلامی روح کے مطابق طے کرنا تھا۔ الغرض فتوحات کے ساتھ ساتھ اس طرح کے بے شمار مسائل تھے جن سے نمٹنا تھا۔ ان تمام معاملات کا تفصیلی ذکر آئندہ کے صفحات میں آئے گا۔

نظام حکومت میں نئی تشکیلات

پھیلتی ہوئی اسلامی ریاست کے نظم ونسق کے لیے خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں دونوں طرح کے انداز اختیار کیے گئے یعنی ایک طرف تو وہ ادارے جو اسلامی سیاسی روح کے مطابق تھے اور عربوں کے ہاں مروج وموجود تھے، ان کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان کو مزید تقویت دی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ نئی تشکیلات بھی کیں، نئی طرحیں بھی ڈالیں اور مفید انتظامی اداروں کو وجود بخشا۔ ذیل میں اجمالاً ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عہدہ قضاء

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ عہدہ قضا سب سے پہلے حضرت عمر نے قائم کیا (۴۲) لیکن سیرت کا طالب علم اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ یہ بیان مبنی برحقیقت نہیں، اس لیے کہ یہ عہدہ خود عہد نبوت میں قائم ہو چکا تھا۔ کتب حدیث میں ''کتاب الاقضیہ'' کے عنوان سے جو باب ہے اس میں ایسی روایات واحادیث منقول ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قاضی کے فرائض وواجبات عہدہ کے شرائط وواجبات شہادت کے احکام وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان فرمادیئے تھے۔ مختلف علاقوں میں آپ نے قاضی بھی مقرر فرمادیئے تھے، لیکن چونکہ دورِ نبوت میں مرجع آخر آنحضرت ﷺ ہی تھے اس لیے قاضی کے اختیارات محدود تھے، جناب صدیق اکبر نے اسے باقاعدہ شکل دی۔ حضرت علی، حضرت معاذ اور بعض دیگر صحابہ کو خدمت قضا پر مامور فرمایا۔ شبلی نے ''الفاروق'' میں لکھا ہے کہ فاروق اعظم دورِ صدیقی میں ''قاضی القضاۃ'' یعنی چیف جسٹس کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ ابن اثیر نے بھی لکھا ہے:

''اس سال ابوبکر نے عمر بن الخطاب کو قاضی بنایا اور خلافت صدیقی میں وہ قضا کا کام کرتے رہے''

اگرچہ عدلیہ کو انتظامیہ سے باقاعدہ الگ کردینے کا کام عہد فاروقی میں تکمیل کو پہنچا، لیکن اس کا آغاز دورِ صدیقی سے ہی ہوگیا تھا، عدلیہ کو انتظامیہ پر کیا تفوق حاصل تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ''ایک مرتبہ اقرع بن حابس اور عیینہ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ایک بے کار زمین جوان کی طرف پڑی ہوئی تھی اس کا مطالبہ کیا، چونکہ یہ دونوں مولفۃ القلوب میں سے تھے، اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی درخواست منظور کرلی اور اس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا۔ اب یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تاکہ پروانہ خلافت کی ان سے توثیق کرالیں،

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھتے ہی سخت غضبناک ہوئے اور پروانہ ان کے ہاتھوں سے لے کر چاک کر دیا اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ اس زمانہ میں تمہاری دلجوئی کیا کرتے تھے جب کہ اسلام کمزور تھا، اب اسلام کافی مضبوط ہے، تم سے جو کچھ ہو سکے کر دیکھو۔ یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر سیدھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور بولے، خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خلیفہ تو عمر ہی ہوتے اگر وہ چاہتے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی غصے میں بھرے ہوئے آ پہنچے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے باز پرس کرنے لگے کہ آپ نے یہ زمین کا ٹکڑا ان دونوں کو کس طرح دیا؟ یہ آپ کی ملکیت ہے یا مسلمانوں کی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے مسلمانوں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تو پھر آپ کو کیا حق تھا کہ ان دونوں کو بخش دیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو بحال رکھا (۴۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو قضا کا محکمہ بالکل الگ کر دیا اور تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کیے۔ اس کے ساتھ قضاء کے اصول و آئین پر ایک فرمان لکھا جو ابوموسیٰ اشعری گورنر کوفہ کے نام تھا اور جس میں صیغہ عدالت کے تمام اصولی احکام درج تھے۔ تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

① قاضی کو منصفانہ انداز میں تمام لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیے۔

② بار ثبوت عموماً مدعی پر ہے۔

③ مدعا علیہ اگر کسی قسم کا ثبوت یا شہادت نہیں رکھتا تو اس سے قسم لی جائے گی۔

④ فریقین ہر حالت میں صلح کر سکتے ہیں لیکن جو امر خلاف قانون ہے اس میں صلح نہیں ہو سکتی ہے۔

⑤ قاضی خود اپنی مرضی سے مقدمہ کے فیصلہ کرنے کے بعد اس میں نظر ثانی کر سکتا ہے۔

⑥ مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہیے۔

⑦ تاریخ معینہ پر اگر مدعا علیہ نہ حاضر ہو تو مقدمہ کا یک طرفہ فیصلہ کیا جائے گا۔

⑧ ہر مسلمان قابل ادائے شہادت ہے لیکن جو شخص سزا یافتہ ہو یا جس کا جھوٹی گواہی دینا ثابت ہو، وہ قابل شہادت نہیں۔

صیغہ قضاء کی عمدگی یعنی فصل خصومات میں پورا عدل و انصاف ان باتوں پر موقوف ہے:

① عمدہ اور مکمل قانون جس کے مطابق فیصلے عمل میں آئیں۔

② قابل اور متدین حکام کا انتخاب۔

③ وہ اصول اور آئین جن کی وجہ سے حکام رشوت و دیگر ناجائز وسائل کے سبب سے فصل خصومات میں رو رعایت نہ کرنے پائیں۔

④ آبادی کے لحاظ سے قضاۃ کی تعداد کا کافی ہونا تاکہ مقدمات کے انفعال میں حرج نہ ہونے پائے۔

حضرت عمر نے ان تمام امور کا اس خوبی سے انتظام کیا کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ قانون کے بنانے کی تو کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسلام کا اصلی قانون قرآن مجید موجود تھا۔ البتہ چونکہ اس میں جزئیات کا احاطہ نہیں، اس لیے حدیث و اجماع و قیاس سے مدد لینے کی ضرورت تھی۔ حضرت عمر نے قضاء کو خاص طور پر ان کے متعلق لکھا۔ قاضی شریح کو ایک فرمان میں لکھا کہ مقدمات میں اول قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو۔ قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث، اور حدیث نہ ہو تو اجماع (کثرت) کے مطابق اور کہیں پتہ نہ لگے تو خود اجتہاد کرو۔ (۴۴)

عہدہ قضا سے متعلق یہ تمام معاملات اسی طرح جناب عثمان اور جناب علی کے دور میں جاری وساری رہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ عہد خلفائے راشدین میں قاضی کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا اور ناجائز آمدنی کی بندش کے لیے بھی مؤثر تدابیر اختیار کی گئیں۔

جیل خانے کی ایجاد

سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جیل خانے کی بنیاد ڈالی۔ حضرت عمر نے مکہ معظمہ میں صفوان بن امیہ کا مکان چار ہزار درہم میں خرید کر اسے جیل خانہ میں منتقل کیا۔ (۴۵)

بیت المال کا قیام

ولید بن ہشام کی رائے پر کہ میں نے سلاطین شام کے ہاں دیکھا ہے کہ خزانہ اور دفتر کا جدا جدا محکمہ ہے، حضرت عمر نے بیت المال کے باقاعدہ قیام کا حکم دیا، اس کے لیے علیحدہ عمارت بنوائی اور عبداللہ بن ارقم کو افسر خزانہ مقرر کیا۔ (۴۶)

محکمہ فوج

جناب فاروق اعظم کی معاصر سلطنتوں میں کہیں بھی باقاعدہ فوج کا منظم نظام نہیں تھا، کہیں نظام جاگیرداری تھا، کہیں فیوڈل سسٹم تھا۔ عہد صدیقی میں فوج کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر نہیں کی گئی تھیں۔ ۱۵ھ میں جناب فاروق اعظم نے ایک زرکثیر حاصل ہونے پر اکابر صحابہ کی مجلس شوریٰ منعقد کی اور ان سے رائے طلب کی کہ اس رقم کا مصرف کیا ہونا چاہیے۔ یہاں پھر ولید بن ہشام نے یہ رائے دی کہ شام کے والیان کو دیکھا ہے کہ ان کے ہاں فوج کا دفتر اور رجسٹر مرتب رہتا ہے۔ حضرت عمر کو یہ رائے پسند آئی اور اس کے مطابق عمل درآمد ہوا۔

رسد کا مستقل محکمہ

حضرت عمرؓ نے رسد کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا جس کا نام اہراء تھا۔ (۴۷) شبلی کی تحقیق کے مطابق یہ طریقہ یونانیوں سے لیا گیا تھا۔ جناب عثمان کے دور میں بحری قوت کا اضافہ ہوا، تاریخوں سے اس کے تفصیلی حالات کا پتہ نہیں چلتا، صرف اتنا معلوم ہے کہ امیر معاویہ کے توجہ دلانے پر بارگاہ خلافت سے ایک جنگی بیڑا تیار کرنے کا حکم ہوا، اور عبداللہ بن قیس حارثی اس کے امیر البحر ہوئے۔ لیکن اس قدر یقین ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی بحری قوت اتنی بڑھ گئی کہ آسانی کے ساتھ قبرص زیر نگیں ہو گیا؟ اور رومیوں کے عظیم الشان بحری بیڑے کو جس میں پانچ سو جہاز تھے، اسلامی بیڑے نے ایسی شکست دی کہ پھر اس نے اسلامی سواحل کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ کی۔ (۴۸)

محکمہ پولیس

صدر اسلام میں پولیس کے لیے عربی زبان کا لفظ ''شرطہ'' بولا جاتا تھا۔ شرطہ کا لفظ شرط سے بنا ہے، اس کی جمع شروط اور شرائط ہے۔ اسی سے شرطہ (پولیس) بنا ہے۔

عہد رسالت مآب ﷺ میں تمام اختیارات کا مرکز و منبع آپ ہی کی ذات والا صفات تھی۔ آپ نے خود اور اپنے صحابہؓ سے بعض وہ امور سرانجام دلوائے جن کے بارے میں اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ معاملات محکمہ پولیس سے متعلق ہیں۔ بازاروں کا گشت، اشیاء کی جانچ پڑتال، مجرموں کی گرفتاری، حبس کی سزا وغیرہ معاملات آپ نے خود نمٹائے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مجرموں کی گردن اڑانے کے لیے بعض افراد مقرر کر دیئے گئے تھے اور حضرت زبیر، حضرت علی، مقداد بن الاسود، محمد بن مسلمہ، عاصم بن ثابت اور ضحاک بن صفیان کلابی اسی خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر پہلے خلیفہ ہیں جن کے عہد میں ''الشرطہ'' پولیس باقاعدہ ایک ادارہ کی صورت میں وجود میں آئی اور پھر جناب علی کے دورِ خلافت میں اس کو زیادہ ترقی ملی۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> پولیس کا صیغہ مستقل طور پر قائم ہو گیا تھا اور اس وقت اس کا نام احداث تھا۔ چنانچہ افسران پولیس کو ''صاحب الاحداث'' کہتے تھے، بحرین پر حضرت عمر نے قدامہ بن مظعون اور حضرت ابو ہریرہؓ کو مقرر کیا تو قدامہ کو تحصیل مالگزاری کی عزت دی اور حضرت ابو ہریرہ کو تصریح کے ساتھ پولیس کے اختیارات دیئے۔ (۴۹)

حضرت علی کے زمانہ میں پولیس نے زیادہ وسعت اختیار کر لی۔ قیس بن سعد بن عبادہ جو حضرت انس کے بقول نبی کریم ﷺ کے لیے صاحب الشرطہ کے درجہ میں تھے، انہیں حضرت علیؓ نے مصر میں اپنا عامل مقرر کیا تھا، قیس بن سعد بن عبادہ حضرت علی کے عہد میں امیر لشکر بھی رہے۔ ان کے پاس ''الشرطہ'' کے نام سے بارہ ہزار نفری پر مشتمل ایک نیم عسکری دستہ تھا، جو عسکری مہمات کے علاوہ پولیس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ یہ دستہ ان کے پاس حضرت علی کی وفات کے بعد بھی رہا۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں پولیس کے فعال ہونے پر ایک واقعہ سے بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں پولیس کے لیے ''عسس'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ واقعہ کی نوعیت یہ ہے کہ حضرت علی کے زمانہ میں ایک شخص کو ایک غیر آباد مکان سے اس طرح گرفتار کیا گیا کہ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی اور مقتول کی لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔ جب اس سے قتل کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ قتل میں نے کیا ہے، لوگ اسے قتل کرنے کے لیے لے جانے لگے تو ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا اے لوگو! جلدی نہ کرو، اسے حضرت علی کے پاس لے چلو، حضرت علی کے پاس جا کر اس دوسرے شخص نے کہا کہ مقتول کو اس شخص نے قتل نہیں کیا بلکہ میں نے قتل کیا ہے۔ اس پر حضرت علی نے پہلے شخص سے پوچھا کہ تم نے یہ کیسے کہا کہ تم نے قتل کیا ہے۔ دوسرے سے فرمایا کہ تم نے اپنے آپ کو قاتل کیوں بتایا۔ اس نے کہا کہ دراصل میں قصاب ہوں۔ صبح سویرے میں نے گائے ذبح کی اور اس کی کھال اتارنے لگا۔ اسی دوران مجھے پیشاب

کی شدت محسوس ہوئی تو میں پاس ویرانے میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ پیشاب کر کے دیکھا کہ لاش پڑی ہوئی ہے اور میرے ہاتھ میں اسی طرح خون آلود چھری تھی، میں پریشانی کی حالت میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، کہ پولیس (عسس) پہنچ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میری کوئی بات نہیں سنی جائے گی تو میں نے قتل کا اعتراف کرلیا۔(۵۰)

ادارہ احتساب کا قیام

احتساب اور حسبہ کے معنی خالصتہ اللہ کے لیے کرنے کے آتے ہیں۔ نیکی کا جو کام خالص اللہ کے لیے اور صرف اجر وثواب کی اُمید پر کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہ کام ''حسبۃ للہ'' اور ''احتساباً'' کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشہور حدیث جس کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اس میں احتساب کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ حدیث یہ ہے:

((من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفرله ما تقدم من ذنبه))

''جس شخص نے پورے ایمان ویقین کے ساتھ اور خالصتہ اللہ کے لیے رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں''۔

عربیت کے قاعدہ سے لفظ احتساب کے بعد جب علیٰ کا صیغہ استعمال ہو تو اس میں اس کام کے اسی جذبہ کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے خلاف کرنے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہا جائے: "احتسب فلان علی فلان عمله" (فلاں شخص نے فلاں شخص کے اس کام کے خلاف اس پر سخت نکیر کی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا)۔(۵۱)

احتساب کی اصطلاحی تعریف امام غزالیؒ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

احتساب سے مراد یہ ہے کہ حقوق اللہ سے متعلق کسی منکر سے یعنی ناپسندیدہ کام کے ارتکاب سے روکا جائے تاکہ جس کو روکا جارہا ہے وہ اس برائی کے ارتکاب سے باز رہے۔(۵۲)

علامہ ابن خلدون نے نہایت جامع تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

((هی وظیفة دینیة من باب الامر بالمعروف والنهی عن المنکر))(۵۳)

''یہ ایک دینی منصب ہے جس کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے''۔

عہد رسالت مآب ﷺ میں آپ ﷺ بنفس نفیس یہ کام سرانجام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ بازار کا

معائنہ فرمانے کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں ایک صاحب گندم فروخت کر رہے تھے اور گندم کا ڈھیر سامنے لگا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے گندم کے ڈھیر میں دست مبارک ڈالا تو نیچے سے گندم تر نکلی، آپ نے گندم والے سے فرمایا، یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ بارش میں بھیگ گئی تھی۔ فرمایا اس گیلی کو اوپر کیوں نہ رکھا، عرض کی یا رسول اللہ پھر کون خریدتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے یاد رکھو جو شخص اس طرح کی ہیرا پھیری یا دھوکہ بازی کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ (۵۴)

اس حدیث مبارکہ کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ غش (ہیرا، پھیری، دھوکہ بازی، ملاوٹ) کے مفہوم میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں:

① سودا فروخت کرتے وقت اس کا عیب چھپانا۔

② جو سودا دکھایا ہو وہ نہ دینا اور اس کے بجائے کوئی اور سودا دے دینا۔

③ لوگوں کو کھانا مہیا کرتے وقت عام معیار سے کم درجہ کا سامان استعمال کرنا۔

④ کھوٹے سکے بنانا اور چلانے کی کوشش کرنا۔

⑤ عطریات میں ملاوٹ کرنا۔

⑥ کیمیاوی طریقوں سے مصنوعی سونا یا چاندی بنانا۔ (۵۵)

بعد میں جب اسلامی ریاست مدینہ سے باہر پھیل گئی تو اس کام کے لیے مستقلاً آدمی مقرر کیے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور مکہ مکرمہ میں حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو محتسب مقرر کیا گیا۔ (۵۶)

اندرونی خلفشار کے سبب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس ادارہ کو خاص ترقی نہیں ملی، جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس ادارہ کو بہت ترقی دی اور جا بجا محتسبین مقرر فرمائے۔ حضرت محمد مسلمہ انصاری کو محتسب اعلیٰ کی ذمہ داری سونپی گئی اور ان کے علاوہ جا بجا محتسبین مقرر فرمائے۔

دوسری اقوام کے مفید انتظامی تجربات سے فائدہ

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اسلامی ریاست میں موجود اداروں کو مستقل شکل جناب فاروق اعظم کے دورِ حکومت میں ہی ملی، اور پھر بعد کے دونوں خلفاء نے اس نظم کو قائم رکھا۔ جناب فاروق اعظم نے اسلامی روح کے مطابق "الحکمة ضالة المومن" کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جہاں سے بھی کوئی ایسی چیز ملی جو امت کے لیے نفع بخش تھی، اسے قبول کر کے اسلامی نظام کا حصہ بنا دیا اور قطعاً کسی تعصب کو خاطر میں نہیں لائے، اور یہی انداز فکر رہا جس کو آنحضرت ﷺ نے روشناس کرایا تھا۔

خود آنحضرت ﷺ نے عرب جاہلیہ کے بعض قوانین اور رسومات کو اور پہلی شرائع کو من وعن قبول فرمایا اور آپ کے صحابہ نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> آنحضرت ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے خون بہا کی مقدار دس اونٹ مقرر کی تھی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ قتل ناحق سے باز نہیں آتے تو انہوں نے اس کی مقدار ایک سو اونٹ تک بڑھا دی۔ پیغمبر خدا ﷺ نے اس کو برقرار رکھا۔ "قسامہ" جس کا حدیثوں میں ذکر آتا ہے، اس کو سب سے پہلے ابوطالب نے رواج دیا۔ عرب جاہلیہ میں دستور تھا کہ قوم کا رئیس (جس کو وہ شیخ کہتے ہیں اور جس کی حیثیت چھوٹے پیمانے پر حکمران کی ہوتی ہے) ان کی آمدنی سے چوتھا حصہ وصول کرتا تھا، آپ نے اس کو اور بھی گھٹا کر مالِ غنیمت میں سے ۵/۱ حصہ بحق سرکار لینے کا حکم نافذ کیا۔ عشر اور خراج (جو زمین کا ٹیکس یا مالیہ اور لگان ہے) آپ کی بعثت سے پہلے کیقباد اور اس کے بیٹے نوشیرواں نے اپنی رعیت پر عائد کر رکھا تھا۔ شرع نے بھی اس کو بحال رکھا، بنی اسرائیل میں زانی کو رجم کی سزا دینا، چور کا ہاتھ کاٹنا اور جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ سزائیں مقرر تھیں، شریعت محمدیہ نے ان کی کوئی ترمیم وتنسیخ نہیں کی۔

جناب فاروق اعظم نے "دفتر رسد، کاغذات، حساب، ان تمام انتظامات میں انہوں نے ایران اور شام کے قدیم قواعد پر عمل کیا۔ البتہ جہاں کوئی نقص پایا اس کی اصلاح کر دی۔ عراق کے بندوبست کا جب ارادہ کیا تو حذیفہ اور عثمان بن

حنیف کے نام حکم بھیجا کہ عراق کے دو بڑے زمینداروں کو میرے پاس بھیج دو، چنانچہ زمیندار مع مترجم کے ان کے پاس آئے اور انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ سلاطین عجم کے ہاں مالگزاری کی تشخیص کا کیا طریقہ کار تھا۔ جزیہ حالانکہ بظاہر مذہبی امور سے تعلق رکھتا تھا، تاہم اس کی تشخیص میں وہی اصول ملحوظ رکھے جو نوشیرواں نے اپنی حکومت میں قائم کیے تھے۔(۵۷)

علی ہذا القیاس خلفائے راشدینؓ نے ہر کام اور امور ملکی سے متعلق انتظام جو اپنے اندر خیر کا پہلو رکھتا تھا اسے بغیر کسی تعصب کے قبول کیا۔

عرب جاہلیہ کی حکومتی اور سیاسی روایات سے تجاوز

عرب جاہلیہ میں سیاسی معاملات اور بالخصوص مکہ کی شہری مملکت سے متعلق باب دوم اور باب سوم میں تفصیلی ذکر موجود ہے اور ماخذ بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد اسلام کا سیاسی نظام عہد نبوی میں اور پھر خلفائے راشدین کے ادوار میں ارتقائی منازل طے کرتا رہا اس کا ذکر بھی متعلقہ حصوں میں کر دیا گیا ہے۔ یہاں اس تناظر میں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ خلفائے راشدین نے عہد جاہلیہ کی حکومتی اور سیاسی روایات سے کس حد تک فائدہ اٹھایا۔

ضمناً یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی قوانین کا تعلق فقہی معاملات سے ہو یا وہ امور سیاسیہ سے تعلق رکھتے ہوں، اس میں عرف یا رواج کو بہت حد تک دخل حاصل ہے۔ ایسا عرف اور رواج جو کسی معاشرے کی اچھائی اور خیر کے پہلو کی عکاسی کرتا ہو اور نصوص اسلامی سے متصادم نہ ہو اسے اسلام نے قبول کرنے سے قطعاً تامل نہیں کیا:

> ''عرف و عادت یہ ہے کہ کوئی فعل یا طریقہ عقلی طور پر لوگوں کے نفوس میں اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ فطرت سلیمہ اسے قبول کر لے اور اسلامی دنیا کے سلیم الطبع لوگ اس کے عادی ہو جائیں، بشرطیکہ وہ نص شرعی کے برخلاف نہ ہو''۔(۵۸)

اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم عرب جاہلیہ کی ان سیاسی اور حکومتی روایات کو دیکھتے ہیں جو عامۃ الناس کے لیے مفید تھیں اور فکر اسلام سے متصادم نہیں تھیں، تو انہیں اسلام نے من وعن قبول کر لیا۔ اس کی واضح مثالیں، عرافہ، نقابہ، حلف اور ولاء کے سیاسی ادارے ہیں۔ وہ عہد جاہلیہ میں موجود تھے، آنحضرت ﷺ نے بھی انہیں باقی رکھا اور پھر خلفائے راشدین نے بھی انہیں قبول کیا۔ لیکن اسلام نے اس طرزِ سیاست کو مسترد کر دیا جو اسلام کے عالمگیر اصول

سیاست میں رکاوٹ تھیں۔ مثلاً عربوں کی سیاست کا مرکز ومحور قبیلہ تھا۔ وہ مجموعی طور پر اس قوت جامعہ سے محروم تھے جس کو آج کل حکومت وسلطنت کا نام دیا جاتا ہے، کوئی مرکزی نظام موجود نہیں تھا۔ عہد خلفائے راشدین میں اسی قبائلی طرز سیاست کو ختم کر کے ایک وسیع البنیاد حکومت کی بنیاد ڈالی گئی جس میں خلیفہ کا چناؤ عوام کی مرضی کے تابع تھا اور انتخاب کے بعد خلیفہ قبائلیت کی سطح سے بلند ہو کر امت مسلمہ کے مفاد کے نقطہ نظر سے غور وفکر کرتا تھا۔

عرب یوں تو قبائل میں محدود تھے لیکن جہاں کہیں ان کو تھوڑی بہت وسعت ملتی تھی ان کا میلان ورجحان بادشاہت کی طرف ہو جاتا تھا۔ خلفائے راشدین نے اپنی طرز سیاست سے اس فکر کو بھی مسترد کر دیا۔

مکہ کی وہ حکومت جو آنحضرت ﷺ سے ۱۳۰ برس پہلے آپ کے جد امجد قصیٰ ابن کلاب نے قائم کی تھی۔ اگرچہ وہ حدود حرم کی اساس پر صرف ایک سو تیس مربع میل پر مشتمل تھی مگر اس میں حکومت کی کسی حد تک ایک منظم صورت نظر آتی ہے۔ اسی میں ایک مجلس وزراء بھی تھی نیز مجلس شوریٰ کا وجود بھی ملتا ہے، لیکن مکہ کی مجلس شوریٰ میں صرف معمر شخص جن کی عمر کم از کم چالیس سال ہو، نمائندگی کر سکتے تھے، اسلام نے اس مجلس شوریٰ کے ادارے کو صرف قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اسے توسیع دی، مستحکم بنیادوں پر استوار کیا، مگر عمر کی قید باقی نہیں رکھی اور اہلیت وصلاحیت کو بنیاد بنایا۔

حکومتی استحکام میں بنیادی چیز لوگوں کو انصاف کا ملنا ہوتا ہے، عربوں کے ہاں ثالثی کا طریقہ بھی مروج تھا اور تحکیم کا اصول بھی رائج تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ بے حد توہم پرست تھے، اس لیے مقدمات کے فیصلوں میں کاہنوں کا بھی بہت عمل دخل تھا۔ اسلام نے حکومت کے اسی بنیادی ڈھانچے سے اس توہم پرستی کو نکال باہر کیا اور عہد خلفائے راشدین میں انصاف کے لیے باقاعدہ ادارے منظم کیے گئے، محکمہ پولیس ہو یا قضا واحتساب کے محکمے، ان کا بنیادی مقصد صرف یہی تھا کہ لوگوں کو بے لاگ انصاف مہیا ہو۔ بعینہٖ بیع وشرائع کے وہ طریقے جن میں دھوکہ کا عنصر شامل تھا انہیں رد کر دیا اور باقی کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ معاشرت کو لیجئے تو وہاں بھی نکاح وطلاق کے بعض اسالیب کو مسترد کیا اور بعض کو قائم رکھا۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اصولوں کی عملداری کا خواہاں ہے، امن چاہتا ہے، عامۃ الناس کی عزت وتوقیر چاہتا ہے۔ اسے عدل قائم کرنا ہے۔ قیام حکومت کے لیے مشاورت چاہتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اعدلو هو اقرب للتقوى﴾ اب یہ انصاف مہیا کرنے کے لیے کیسا نظام ترتیب دیا جائے، عدالتوں کے کتنے

درجے مقرر کیے جائیں، اسلام کو ان تفاصیل سے بحث نہیں، اس کا تقاضا تو حصول انصاف ہے، ذرائع سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وشاورھم فی الامر﴾ امیر المومنین کو امورِ حکومت طے کرنے کے لیے مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اب وہ حصول مشورہ کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے۔ قومی اسمبلی ہو، سینٹ ہو یا ان جیسا کوئی اور ادارہ۔ اسلام اس سے بحث نہیں کرتا، اس کا مقصد تو یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات ان کی مرضی ومنشاء سے طے پانے چاہئیں، عوام الناس کی مرضی کے خلاف کوئی شخص ان پر مسلط نہ ہو۔ علی ہذا القیاس۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ محمد اسحاق صدیقی، اسلام کا سیاسی نظام، (مجلس بحوث وتحقیق اسلامی بنوری ٹاؤن، کراچی، ۱۹۸۱ء) ص ۲۷

۲۔ القرآن۔ سورۃ الشوریٰ-۴۹

۳۔ ابوحیان الاندلسی، بحر المحیط، دار السعادۃ، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ج:۱، ص ۱۴۰

۴۔ زمخشری، کشاف، ج۱، ص ۶۱

۵۔ عماد الدین ابن کثیر دمشقی، تفسیر القرآن العظیم، ج:۳، ص ۳۰۰

۶۔ احکام القرآن، ج:۱، ص ۹۷

۷۔ القرآن، سورۃ الحشر ۷

۸۔ صحیح البخاری، باب الجہاد تحقیق مصطفیٰ دیب البغا، طبع دمشق، بیروت ۱۹۸۷ء، ج:۳

۹۔ تاریخ ابن خلدون، ج:۱، ص ۱۶۱

۱۰۔ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص ۴، ت-ل

۱۱۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۴

۱۲۔ مقدمہ ابن خلدون، ج:۲، ص ۱۶۱

۱۳۔ انور شاہ کشمیری، فیض الباری، ج:۴، ص ۴۹۸

۱۴۔ ہیکل، محمد حسین، الصدیق ابوبکر، مطبعہ مصر، شرکتہ مساہمہ مصریہ ۱۹۵۸ء، ص ۶۷

۱۵۔ بدر الدین عینی، عمدۃ القاری شرح بخاری، ص ۴۸۶

۱۶۔ محمد امین ابن عابدین، رد المختار، (مطبع المیمنیہ، قاہرہ ۱۳۱۸ھ)، ج:۱، ص ۵۱۲

۱۷۔ محمد بن عبدالکریم الجزری، اسد الغابہ، (قاہرہ ۱۲۸۵ھ)، ج:۲۱، ص ۲۲

۱۸۔ محمد خالد مسعود ''تاریخ اسلام میں اہل حل وعقد کا تصور'' فکر ونظر، جنوری-فروری ۱۹۶۴ء

۱۹۔ ابن قتیبہ الدینوری، الامامۃ والسیاسۃ (مطبع نیل، قاہرہ، ۱۳۲۲) ص ۴۵

۲۰۔ ابن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک (مطبع حسینیہ مصر، ت-ن)، ج:۵، ص ۱۵۲

۲۱۔ فتح الباری، ج:۱۳، ص ۱۶۸

۲۲۔ فتح الباری، ج:۱۳، ص ۱۶۴

۲۳۔ ابن کثیر، البدایہ و النہایۃ، (قاہرہ، ۱۹۳۲ء)، ج:۶، ص ۳۰۱

۲۴۔ ابن خلدون، ج:۲، ص ۸۱

۲۵۔ طبری، ابن جریر، تاریخ الرسل والملوک، ج:۳، ص ۲۰۸

۲۶۔ رشید اختر ندوی، خلافت راشدہ اور جمہوری قدریں (چٹان پریس میکلوڈ روڈ، لاہور ۱۹۶۶ء)، ص ۱۶

۲۷۔ القرآن، سورہ یونس، آیت ۱۸

۲۸۔ الطبری، ج:۳، ص ۲۰۶-۲۰۷

۲۹۔ الطبری، ج:۳، ص ۳۰۷

۳۰۔ المسعودی، ج:۲، ص ۳۰۷

۳۱۔ ابن سعد، طبقات، ج:۳، ص ۱۲۲-۱۲۳

۳۲۔ ابن سعد، طبقات، ج:۳، ص ۱۴۲

۳۳۔ ابن خلدون، ج:۲، ص ۱۳۷

۳۴۔ ابن سعد، طبقات، ج:۳، ص ۲۴۹

۳۵۔ ابن کثیر، ج:۷، ص ۱۴۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۳۸۔ ابن خلدون، ص ۴۳۰

۳۹۔ شیخ علی المتقی، کنز العمال، ج:۳،ص ۱۳۹
۴۰۔ شبلی، الفاروق، حصہ دوم (مطبوعہ رحمانیہ، لاہور) ۱۸۸
۴۱۔ شبلی، الفاروق، حصہ دوم (مطبع قدیمی واقع دہلی، لاہور) ص ۱
۴۲۔ ھٹی، تاریخ عرب، ج:۴،ص ۱۷۳
۴۳۔ الاصابہ، (مکتبہ التجاریہ الکبریٰ، قاہرہ ۱۹۳۹ء) ج:۳،ص ۵۶
۴۴۔ شبلی، الفاروق، حصہ دوم، ص ۲۲۱
۴۵۔ مقریزی، ج:۲،ص ۱۸۷
۴۶۔ شبلی، الفاروق، حصہ دوم، ص ۲۲۹
۴۷۔ تاریخ طبری، ص ۲۶۲۵
۴۸۔ شاہ معین الدین ندوی، سیرہ خلفائے راشدین، (ادارہ نشریات اسلام، اُردو بازار، لاہور)، ص ۲۲۵، ۲۲۶
۴۹۔ شبلی، الفاروق، (مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور) حصہ دوم، ص ۲۲۷
۵۰۔ ابن قیم، الطرق الحکمیہ، (قاہرہ، ۱۳۱۷ھ)، ص ۵۵
۵۱۔ محمود احمد غازی، فکر ونظر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، شمارہ مارچ-اپریل ۱۹۸۳ (نفاذ شریعت نمبر)
۵۲۔ غزالی، احیاء علوم الدین، طبع قاہرہ، جلد دوم، ص ۳۲۳
۵۳۔ مقدمہ ابن خلدون، طبع ۱۹۷۸ء، ص ۲۲۵
۵۴۔ صحیح مسلم، ج دوم، ص ۱۵۹
۵۵۔ ابن تیمیہ، الحسبہ فی الاسلام، ص ۱۱، ۱۲
۵۶۔ عبدالحیٔ الکتانی، التراتیب الاداریہ، ج:۱،ص ۲۸۷
۵۷۔ الفاروق، حصہ دوم، ص ۳۱۰
۵۸۔ حسن علی الشاذلی، المدخل فی الفقہ الاسلامی، ص ۲۲۰